

رسائل و مسائل

اسلام اور جمہوریت پر سوالات

(۲)

سوال:-

جمہوریت کو مغربی نظام سیاست کی بنیاد کہا جاتا ہے اور جمہوریت کا اصل اصول یہ ہے کہ مملکت کے تمام امور اکثریت کی رستے سے طے ہوں۔ یعنی جمہوریت اکثریت کو اس امر کے فیصلے کا غیر مشروط اور لامحدود اختیار دیتی ہے کہ حق کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ کیا آپ اس اصل اصول کو اسلامی ریاست کے مقصد، غشا اور مزاج کے مطابق قرار دیتے

ہیں۔

جواب:-

جی نہیں! کوئی بھی ریاست جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر قائم نہ ہو اور جس میں آخری فیصلے کا انحصار قانونِ الہی پر نہ ہو، وہ اسلامی ریاست نہیں ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ صحیح اسلامی اساسیت پر جو ریاست استوار ہو اس میں حاکمیت الہی کے دائرے میں اور قانونِ شریعت کے تحت اکثریت ہی کی رائے سے فیصلے ہونے چاہئیں، ورنہ کئی طرح کے بگاڑ پیدا ہوں گے۔

سوال:-

قرآن مجید اور حدیث رسولؐ نے جو اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ ہیں، کسی مستقل نظام سیاست و حکومت کو اپنا نامسلمانوں کے لیے لازمی قرار نہیں دیا۔ لہذا بہت سے علماء و مفکرین جمہوریت کو اسلامی ریاست کے لیے قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس

ایسے مدبر و مفکر بھی ہیں جو اس تصور کو قابل قبول قرار دیتے ہیں۔ آپ کی رائے کیا ہے؟
جواب :-

میرے نزدیک اسلام کے اصول حکمرانی معین ہیں۔ بنیادی دستوری اصول مقرر ہیں، البتہ سیاسی مشینری اور ڈھانچے کو حسب حال ادلا بدلا جاسکتا ہے۔ اور نئی شکلیں بھی ایجاد کی جاسکتی ہیں جمہوریت کی بحث بجلتے خود ایک الگ بحث ہے۔ اسلام جس مساوات و اخوت کا نقیب ہے، سیاست میں اس کا تیبہ کسی نہ کسی طرح کی جمہوریت ہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ مگر مغربی جمہوریت اصول و اساس کے اعتبار سے اسلام سے تضاد رکھتی ہے۔ اصول و اساس بدل دیں تو ڈھانچہ کام دے سکتا ہے۔
سوال :-

مغربی نظام سیاست نے اکثریت کی رائے معلوم کرنے کے لیے ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا یکساں حق دیا ہے۔ گویا ایک عالم، ایک بے علم، ایک ماہر اور ایک غیر ماہر ایک نیکو کار اور غلط کار کی رائے یکساں اہمیت رکھتی ہے۔ کیا آپ اس مشروط بالغ حق رائے دہی کو اسلامی ریاست کے لیے قابل قبول قرار دیتے ہیں۔

جواب :-

بالکل غیر مشروط بالغ رائے دہی تو آج بھی کہیں نہیں ہے۔ البتہ فرق و امتیاز کسی اسلامی اساس پر نہیں ہے۔ آپ کوئی دوسری مناسب کسوٹیاں مقرر کر سکتے ہیں اور پابندیاں لگا سکتے ہیں۔ مگر سوال میں دو باتیں گڈ ٹڈ ہیں۔ ایک ہے رائے عام اور دوڑ کی تربیت کا کام جو افراد، جماعتوں، اداروں، تعلیم گاہوں، اخبارات، خطبات مساجد اور حکومتی وسائل سے مسلسل ہوتے رہنا چاہیے۔ خاص طور پر دینی گروہوں اور سیاسی پارٹیوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی تربیت کریں۔ دوسری چیز ہے ادارات اور قانون کے ذریعے جبری امتیازات قائم کر کے انہیں منوانا۔ یہ ہتھیار صرف چند اہم اور ناگزیر صورتوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے، جیسے کسی کے سابق مجرم ہونے، کسی دوسری صورت میں سزا یافتہ ہونے اور بعض فرائض کا تارک یا محرمات کا مرتکب ہونے کی صورت میں کچھ دو ٹوک سے عام اصول بن جائیں۔ بقیہ امور میں آپ کو حضرت امام ابوحنیفہؒ کی اس گراں بہا تحقیق سے باخبر ہونا چاہیے کہ عدالتوں اور قانونی اداروں اور سیاسی ہیٹوں کے سامنے اعلیٰ سے

اعلیٰ عالم و متقی اور ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان (جب تک وہ مسلمان ہے) کا مرتبہ یکساں ہوگا۔ مدعی حضرت علی ہوں اور بیٹے یا غلام کے علاوہ کوئی گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کا ایمانی مرتبہ اور مقام علم و تقویٰ عدالت سے ان کے حق میں فیصلہ نہیں دلواسکے گا۔ یہی حالی تمام اجتماعی ادارے کا ہے بلکہ یہ تصور عجیب و غریب سا ہے کہ آیا ایک ایک فرد کی زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اتنی تفصیلاً جمع کی جاسکتی ہیں کہ اسے آپ کے پیش نظر معیار علم و تقویٰ کے لحاظ سے برتر تسلیم کیا جائے۔ کون لوگ سرٹیفکیٹ دیں گے؟ کیا سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کی رشوت نہیں دی جاسکتی؟ تعلقات اور سفارشات کا دخل نہیں ہو سکتا؟ پھر کیا ہرگز سچوٹ کو قابل و ماہر سمجھا جائے گا اور ہر مصلحتی و ضابطہ کو متقی — خواہ اس کا تصور دین بنیاد ہی سے صوفیانہ ہو؟ کون ایک ایک فرد کے متعلق گواہی دے گا کہ آیا فی نفسہ اس کا تصور دین و تقویٰ درست ہے اور یہ اسی کے مطابق سرگرم عمل بھی ہے؟ اور پھر کیا ہر ووٹر کے ووٹ کی قدر و قیمت بھی کارڈ پر درج ہوگی کہ اس کا ۱ ووٹ مساوی ہے ۳۱ ووٹوں کے، یا ۸۸ ووٹوں کے؟

سیدھی سی بات ہے کہ قافرن صرف موٹی موٹی شرائط و تحدیدات لگا سکتا ہے۔ بقیہ سارا کام ان قوتوں کو کرنا ہے جن کی ذمہ داری تربیت عوام ہے۔ اگر رائے عامہ کی تربیت کرنے والے موجود نہ ہوں، یا کمزور ہوں، یا ان کی محنتوں کے باوجود عوام کی ذہنی و اخلاقی تعمیر نہ کی جاسکے تو پھر پوچھنا چاہیے کہ ایک قوم اپنی مرضی سے تباہی کی طرف جانا چاہتی ہے۔ موقع ملے تو اسے جبریت کے ذریعہ اس وقت تک روکیے، جب تک کہ اسے روکا جاسکے۔ اور جبریت کے لیے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ

لے کیا یہ سوچا جاسکتا ہے کہ ڈرائیونگ لائسنس، پاسپورٹ، راشن کارڈ یا ایکسپورٹ ایمپورٹ لائسنس، یا سرکاری انتظام سے تقسیم ہونے والے پلاٹ یا مکان یا دکانیں صرف متقی افراد کو ملا کر یں، یا جو لوگ بھی ثابت کر دیں کہ وہ ایمان و علم و تقویٰ میں دوسروں سے برتر ہیں۔ اور مختلف سرکاری عہدوں اور نوکریوں اور راشن ڈپوٹوں وغیرہ کے معاملے تو اور بھی اہم ہوتے، بلکہ کل کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور گاڑی کی ریزرویشن بھی ترجیحاً نیک لوگوں کو ملنی چاہیے۔

کہاں تک اسلامی ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ ”ترکتان جانے والے کے آگے کوئی حساس اور قوی شخص آکر کھڑا ہو گیا کہ ادھر نہیں جانا ہے، کیسے کی طرف جانا ہے۔ یہ وقتی تدبیر ہے، اصل علاج نہیں۔ اصل علاج تعلیم عوام اور تربیت عوام ہے۔ میں نے تبلیغ کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ اس کا مفہوم سکڑ کر ایک خاص شکل اختیار کر گیا ہے آج جو لوگ اس قسم کی بحثیں اٹھا رہے ہیں، تربیت عوام کی اصل ذمہ داری سے بیشتر فرار کردہ عناصر ہیں۔ مدتوں سے یہ اصل کام چھوڑ چکے ہیں لہذا اب ان کی سوچ بچار یہی کچھ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ عصا مردے از غیب ایسا نمودار ہو جائے جس کو اسلام سے کسی شکل میں دل بستگی ہو تو بس وہ معاشرے کو کوٹ پیٹ کر اسلامی بنا دے۔ یہ شکست خوردہ ذہنیت ہمارے ان دکور دور تک پاٹی جاتی ہے۔ اگر کوئی سچا داعیِ اسلام موجود ہو تو وہ خوب سمجھتا ہے کہ اگر خدا پرستی، توحید، محبتِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور حکمتِ قرآن کی توراہیت کی دعوت دے کہ لوگوں پر اثر ڈالا جاسکتا ہے تو معیارِ قیادت اور انتخابات کے لیے بھی مناسب تربیت دی جاسکتی ہے۔

مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ان کا تصورِ تقویٰ ایک حد تک بگڑا ہوا ہے۔ ذاتی طور پر ہمیں ہر نمازی کو قابلِ احترام سمجھنا ہوں، لیکن معاشرے کے عوام بلکہ ذہین عناصر کا بھی خیال یہ ہے کہ جب متقی لوگوں کی بات کی جاتی ہے تو ہر نمازی، ہر ڈاکٹر ہی والا، ہر امام مسجد، ہر مؤذن، ہر مدرس اور ہر واعظ اس گروہ میں آتا ہے، جب کہ اپنے علم و مطالعہ اور اپنے عملی رویے اور معاملات اور اجتماعی نصب العین کی محبت کے لحاظ سے اس گروہ سے باہر کے کئی لوگ کتر نہیں ہیں۔ مگر وہ تقویٰ کی ”فارم“ کو پورا نہیں کرتے۔ اس طرح بہت سے لوگ مٹھا کر لیسے اور ملا کر لیسے کے کاہنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم مروجہ اصطلاح کے لحاظ سے تمام منتقیوں کو چین کر حکومت کے مناصب تک لے جائیں تو چند دنوں میں اسلامی نظام کے حسین خواب کے پرزے اڑ جائیں گے، کیونکہ امام اور واعظ تو کجا، ہر مفسر اور محدث تک کو نظامِ حکومت اور عملی سیاست اور جدید دور کے مسائل اور ان کے مختلف اچھے اور برے حل معلوم نہیں، ہیں تو ماہرانہ حد تک تو بالکل نہیں۔

پس اس وقت اگر کام چل سکتا ہے تو منتقی کی اصطلاح کے معروف مفہوم کو تبدیل کر کے

اسے ایسی شکل دینی ہوگی کہ ایک طرف اس کے دائرے میں ایسے جدید تعلیم یافتہ اور ماہر امور سیاست و معیشت داخل ہو سکیں جو ایمانی اور مقصدی اور اخلاقی لحاظ سے اگر بہت اعلیٰ مقام پر نہیں تو کم سے کم بقدر ضرورت قدر و قیمت رکھتے ہوں۔ دوسری طرف ایسے علماء یا مذہبی طبقتوں کے افراد کو لیا جاسکتا ہے جو جدید مسائل اور سیاسی احوال و ظروف کے منعلق بصیرت رکھنے کے ساتھ ایسے کشادہ ظرف بھی ہوں کہ وہ تھوڑے بہت اختلافات رکھنے والوں کے ساتھ مل کے چل سکیں۔ اہمیت ہمیں ان شخصیتوں کو دینی چاہیے جو بیک وقت دونوں طرح کی ماہرانہ واقفیت کے ساتھ اچھا کردار رکھتے ہوں۔ ایسے ہی لوگ اس دور میں حکومت چلا سکیں گے اور ایسے لوگوں میں ہمیں ایمان و اسلام کی اساسیات کے ساتھ جن دو چیزوں کو دیکھنا چاہیے وہ ہیں بصیرت اور امانت۔ اور ایسے مردانِ کار کی چھانٹ پر کہ معاشرے ہی سے کہدانی ہوگی تاکہ وہ نئی قیادت کا احترام کرے اور ان کی اختیاری تسلیم کرے۔

عملی تدبیر اصلاح کے طور پر ہمیں اس گفتگو کے آخر میں یہ رائے دینا ہوں کہ امیدوارانِ انتخاب (یا نامزد نائندوں) کے لیے آپ نسبتاً سخت اور واضح معیار رکھیے۔ اس تھوڑی تعداد کی چھنٹائی زیادہ آسان ہے۔ بعد ازاں آپ کا مینیا صدر یا وزیر اعظم کے لیے تدریجاً مزید اور معیارات رکھ سکتے ہیں۔ یہی بہترین قابل عمل طریقہ اصلاح ہے۔

سبب ال :-

اگر آپ مغربی نظام سیاست کو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں سمجھتے

تو آپ کی رائے میں اسلامی نظام سیاست کے خدو خال کیا ہونے چاہیے ؟

جواب :-

براہِ من بصیرت یہ ہوئی کہ دورِ رحمت و خلافت میں تو تحریک کے اُبھارے ہوئے لیڈر بغیر کسی غیر معمولی اہتمام کے بسر اقتدار آتے رہے۔ بعد میں ملوکیت آگئی اور یہ مہیت سیاسی اسلامی نہیں تھی۔ اس کے تحت رہتے ہوئے جن مصنفین نے علم سیاست پر لکھا، انہوں نے بھی فقط امیر اور اہلکانِ شوریٰ کے اوصاف کی فہرستیں بنانے پر اکتفا کیا۔ کسی ماہر نے اسلامی نظام حکومت کے لیے کوئی مشینری نہیں سوچی۔ نتیجہ یہ کہ آج تک کے علمائے دین کے پاس وہی اوصاف کا پیمانہ ہے،

مشینری کا کوئی تصور نہیں۔ علمی و فکری لحاظ سے یہ ہماری بڑی فرومانیگی ہے۔
 میرے نزدیک نہایت سنجیدہ فقہائیا جمع ہونے والے انتہائی دیانت دار ۳۱ علماء کا اجماع (۱۹۵۱ء)
 ہی ایک ایسا خاکہ دیتا ہے جس پر موجودہ دور میں کام کیا جاسکتا ہے۔ (ان علماء کا خاکہ جن اصولوں
 پر مبنی ہے وہ اسی شمارے میں دیے جا رہے ہیں)۔
 ہاں! تجربات کے بعد آگے چل کر مزید بہتری پیدا کی جاسکتی ہو تو کی جائے۔ کام چلانے کے لیے
 بہت اچھا بلیو پرنٹ ہمارے پاس موجود ہے۔

سوال :- معزنی جمہوریت نے ہر بالغ شہری کو رائے دہی کا حق دیا ہے۔ اسلام میں ووٹ
 کے لیے بھی تقویٰ معیار ہے۔ وضاحت فرمائیں۔

جواب :-

میرا جواب آپ کے معروضات سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے، مزید یہ کہ میں اس کے لیے ۱۹۵۰ء
 کے اجماع علماء کے ۲۲ اصولوں ہی کی طرف توجہ دلاؤں گا۔

آپ تمام شہریوں کو دیا ان کی بھاری اکثریت کو) یہ کہہ امور حکومت سیاست سے الگ نہیں
 رکھ سکتے کہ تم چونکہ جاہل اور غیر متقی ہو، لہذا تمہیں رائے دینے کا حق نہیں۔ آخر حکومت انہی پر
 چلائی جانی ہے اور انہی کے تعاون سے چل سکتی ہے۔ یہ کام ان کو اعتماد میں لیے بغیر ممکن نہیں۔

۔۔۔۔۔ آج آبادی کی وہ نوعیت

نہیں کہ غھوڑے افراد ہوں اور ہر علاقے اور ہر قبیلے میں فرد فرد کے احوال پر پوری نظر ہو، یہاں تو
 ۸ کروڑ آبادی کا ہجوم ہے، ان کے بالغ افراد کی راپوں، معمولات، رجحانات کی تربیت کرنا اور
 ان کو سمجھنا آسان نہیں ہے، نہ ہم ان کو دور جدید کے ان نظریاتی فتنوں سے بچا سکتے ہیں جو پولیس
 اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے بارش کی طرح ہر آن برس رہے ہیں۔ پھر اگر یہ بگڑ جائیں اور کہیں شورش

اٹھادیں تو آج معاملہ اس حد تک محدود نہیں ہے، جس حد تک سیدنا حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں تھا
 کہ مخربیک ارتداد اور مانعین زکوٰۃ کے خلاف آپ نے قوت کی کسی کے باوجود پورا معرکہ لڑا،
 اور ان منفی شورشوں کی سرکوبی کر دی۔

بہر حال میرے نزدیک ارکانِ شوریٰ کا چناؤ ہونا چاہیے اور اس چناؤ کے لیے دنیا بھر کے تجرباًت کو سامنے رکھ کر ان کے غلط پہلوؤں کو ساقط کر دیا جائے اور صحیح پہلوؤں کو لے لیا جائے، جو بھی صورت ہو، ارکانِ شوریٰ کا انتخاب ہونا چاہیے۔ اور انتخاب بھی انتخاب عام!

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں سیاسی جماعتوں کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور حزبِ اختلاف کا وجود اس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لیے ضروری ہے۔ آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب :-

میں مدتِ عمر سے سیاسی پارٹیوں کے وجود کے حق میں ہوں، کیونکہ یہ بکھرے ہوئے افراد کو منظم کرنے، ان کو دینی شعور اور سیاسی تہمیت دینے کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ میرے نزدیک پارٹیاں اگر مخالفت برائے مخالفت کے اصول پر منظم نہ کی جائیں تو وحدتِ ملت کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ پارٹیاں شعورِ وحدت کو بڑھانے میں مدد دیتی ہیں۔ خود مسلم لیگ نے ہندوستانی مسلمانوں کو جو خاص طرح کا شعور دلایا تھا، کیا وہ پارٹی نہ ہونے کی صورت میں بھی پھیل جاتا۔ اور لوگوں میں منظم تحریک پیدا ہو جاتی؟

پارٹیاں اس لحاظ سے بھی ضروری ہیں کہ وہ عام شہریوں کو بے جا شور و شہ پندی اور تخریب اور انتشار کے خطرات سے بچا کر ان کی سرگرمیوں کو آئینی لاسٹوں پر ڈالتی ہیں۔ تخریب پسند اور ہنگامہ خیز پارٹیوں کو یہی سیاسی پارٹیوں کی حیثیت میں زیرِ غور نہیں لانا۔

اس مسئلے پر میں چونکہ تفصیل سے جوون کے اشارات میں لکھ چکا ہوں، اس وجہ سے ساری باتیں دوہرانا مشکل ہے۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں انتظامیہ اور مقتنہ کا دائرہ الگ الگ ہوتا ہے۔ کیا انتظامیہ اور مقتنہ کی یہ تفریق اسلامی نظامِ سیاست کے لیے ضروری ہے۔

جواب :-

جی ہاں! اگر آپ اپنی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ کریں تو خلیفہ اول کے دور میں یہ واقعہ آپ کے سامنے آئے گا کہ انہوں نے ایک شخص کو جاگیر کا عطا نامہ لکھ دیا۔ پھر وہ حضرت عمرؓ (اس دور کے عدلیہ کے سربراہ) کے سامنے توثیق کے لیے پیش ہوا۔ انہوں نے حضرت کے عطا نامے کو دست نہ سمجھتے ہوئے اسے کالعدم قرار دے دیا۔ وہ شخص پھر خلیفہ کے پاس گیا۔ انہوں نے حضرت عمرؓ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ شان بھی اور تہمتی، اور شروع میں کام بھی محدود تھا۔ اور معاشرہ نہایت صالح اور اطاعت گزار۔ بعد میں رجسٹر بنے، دیوان بنے، دفتر کھلے، قید خانے بنے، عدلیہ کا شعبہ مستقل حیثیت اختیار کر گیا۔ آپ ذرا "قضا اور ادب القاضی" کے ابواب احادیث اور فقہی لٹریچر میں نکال کر دیکھیں۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست میں سربراہ مملکت کا انتخاب براہ راست بھی ہوتا ہے اور بالواسطہ بھی۔ آپ کیا طریق کار تجویز کریں گے؟

جواب :-

میرے نزدیک کسی بھی طریقے کو ضروری اصلاحات اور احتیاطوں کے ساتھ اختیار کیا جاسکتا ہے۔ ضروری یہ ہے کہ پیش نظر ملک اور معاشرے کو دیکھا جائے کہ اس کے حالات میں کونسی صورت آسان اور بہتر رہے گی۔

سوال :-

مغربی نظامِ سیاست ایک معینہ مدت کے بعد، حکومت اور مجالس قانون ساز کا دوبارہ انتخاب ضروری قرار دیتا ہے۔ خلفائے راشدین اور عصر حاضر سے پہلے، اسلامی تاریخ کے دوسرے ادوار میں ہمیں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

جواب :- بعد کے دور کی مثال کو تو اصولی فیصلوں کی کسوٹی نہیں بنایا جاسکتا، خود خلفائے راشدین کے ہاں ایسی کوئی اصولی بات نہیں ملتی ہے کہ جو شخص مقرر ہو وہ لازماً مدتِ العمر کے لیے مقرر ہو، نہ

کوئی نص (کتاب و سنت میں) ایسی ہے کہ کسی امیر یا رکن شوریٰ کو دائمی طور پر جے رہنا چاہیے۔
 "دائمى انارت" کے تصور کو خواہ مخواہ کا اسلامی اصول بنا کر اس پر فتوے دینا کوئی صحیح صورت نہیں۔
 حرفہ آخر!

ان مسائل پر بعض اطراف سے فتووں کے مزاج کی تخریبی آ رہی ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس بات
 کی ہے کہ ان سوالوں کو حکمتِ اجتماعیات (SOCIALOCY) کی روشنی میں رکھ کر دیکھا جائے
 اور اجتماعیات کے بدلتے ہوئے احوال و ظروف کو سمجھا جائے۔ احتیاط بس یہ کرنا چاہیے کہ نصوں
 سے انحراف یا تجاوز نہ ہونے پائے۔ سیاسی ہیئت کے معاملے میں نصوص صرف "حدودِ اربعہ" کے
 نشان لگاتی ہیں، ان نشانات کے اندر مذاہبِ مباحات کا بڑا دائرہ سمجھ بچار کے لیے موجود ہے۔
 اس دائرے کو خواہ مخواہ تنگ کرنے سے پھیدگیں بڑھتی جائیں گی۔ (نئے حصے)